

اصول سیاست و اخلاق و قانون

(مولانا ابوالاعلیٰ مودودی)

میں عرض کر چکا ہوں کہ ایک مسلمان کی حیثیت سے دنیا اور آخرت میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے دو چیزوں کی ضرورت ہے۔ ایک علم۔ دوسرے عمل۔ علم سے مراد یہ ہے کہ انسان اس سے آگاہ اور باخبر ہو کہ اسلام کیا ہے؟ اس کی تعلیم کیا ہے؟ وہ کس چیز کی طرف دعوت دیتا ہے؟ اور دنیا میں زندگی بسر کرنے کے لئے؟ اور کیا دستور، عقل پریش کرتا ہے۔ عمل سے مراد یہ ہے کہ اسلام نے عبادت، اخلاق، معاشرت اور سیاست کے متعلق جو اصول اور قوانین مقرر کئے ہیں ان پر عمل درآمد کیا جائے

مفید نتیجہ پیدا کرنے کے لئے ان دونوں چیزوں کا ساتھ ساتھ ہونا ضروری ہے لیکن ان دونوں میں علم مقدم ہے کیونکہ عمل بغیر علم کے نہیں ہو سکتا۔ اور اگر ہو بھی تو بھیک بھیک جیسا ہونا چاہئے ویسا نہیں ہو سکتا۔ اس میں شک نہیں کہ علم بلا عمل بھی مفید نہیں ہے، مگر جو شخص علم رکھتا ہے اس سے۔۔۔ امید کیجی جا سکتی ہے کہ اس کے عمل میں کسی نہ کسی حد تک اس کے علم کا اثر بھی ضرور آئے گا۔

علم کی بنیاد قرآن ہے۔ اس کتاب پاک میں وہ تمام اصول اور قوانین بیان کر دئے گئے ہیں جن پر اسلام کا مدار ہے۔ لہذا ایک مسلمان کو سب سے پہلے قرآن کو سمجھنا اور اس کی تعلیمات سے باخبر ہونا چاہئے۔ پھر علم کا دوسرا سرچشمہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہے۔ آپ نے ایک نبی کی حیثیت سے ۲۳ سال تک جو کچھ کیا اور جو کچھ کہایا وہ سب قرآن کی تفسیر ہے، اور وراصل قرآن کی حقیقی اور مستند تفسیر وہی ہے علم کا تیسرا سرچشمہ صحابہ کرام کی زندگی ہے۔ انہوں نے قرآن کو خود حال قرآن سے سمجھا

اور قرآن کی علمی اور عملی تفسیر خود اپنی آنکھوں سے دیکھی اور اپنے کانوں سے سنی ہے،
 اس لئے ان کا بھنا دوسروں کی سمجھنے سے زیادہ صحیح اور معتبر ہے پھر جو لوگ ان تینوں
 رشتہ داروں سے استفادہ کر کے اسلام کے اصول اور زندگی کے جزئی مسائل پر ان کو
 منطبق کرنے کے طریقوں کو اچھی طرح سمجھ لیں ان میں یہ قابلیت پیدا ہو جاتی ہے کہ زندگی
 کے عام معاملات میں جو ہر ملک اور ہر زمانے میں نئے ڈھنگ و نئے طور سے پیش آتے
 ہیں، اصول اسلام کے مطابق احکام اور قوانین بنا سکیں کیونکہ جو علم انہوں نے قرآن
 اور سنت رسول اور اسوہ صحابہ سے حاصل کیا ہے اس سے وہ اسلام کی روح تک پہنچ
 گئے ہیں اور ان میں یہ استعداد پیدا ہو گئی ہے کہ جب کبھی کوئی ایسا نیا معاملہ ان کے
 سامنے آئے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کے زمانہ
 میں پیش نہیں آیا تو وہ یہ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ اس معاملہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فتویٰ کیا
 ہوتا یا اگر صحابہ کے سامنے یہی معاملہ آتا تو وہ کیا طرز عمل اختیار فرماتے، اسی چیز کا نام اجتہاد
 اس ترتیب میں قرآن سے پہلے مقدم ہے، پھر سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پھر صحابہ پھر اہل علم
 کا اجتہاد لیکن بدقسمتی دیکھئے کہ آجکل اور نہ صرف آجکل بلکہ گذشتہ کئی صدیوں سے مسلمانوں
 کے جہلانے نہیں، علمائے اس ترتیب کو بالکل الٹ دیا ہے۔ وہ طلب علم میں اپنی ساری توجہ
 ان اہل علم کی کتابوں پر صرف کرتے ہیں جنہوں نے اسلام کی ابتدائی صدیوں میں اپنی تہذیب
 اور فہم و بصیرت اور اپنے زمانہ کے حالات کے مطابق اجتہاد کر کے اسلام کے عقائد اور
 قوانین کی تشریح و توضیح کی ہے اس کے بعد تھوڑی بہت کوشش سنت رسول اور اسوہ صحابہ
 کا علم حاصل کرنے میں بھی صرف کی جاتی ہے لیکن سب سے کم توجہ اور عنایت جس چیز کے حصہ
 آتی ہے وہ قرآن ہے۔ آپ مذہبی تعلیم کے کسی نصاب کو اٹھا کر دیکھ لیجئے، آپ کو اس میں
 زیادہ فقہ، اصول، عقائد، کلام کی کتابیں ملیں گی اس کے بعد احادیث و آثار کا نمبر آئیگا
 مگر آپ محسوس کریں گے کہ ہر نصاب میں یہ مضمون صرف اس غرض کے لئے لکھا گیا ہے کہ اس سے

اللہ کا بندہ خود دانش کی کتاب اور اس کے اقوال و اعمال پر نگاہ ڈال کر یہ دیکھنے کی کوشش نہیں کرتا کہ اگر وہاں فروع میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو اس مسئلہ میں ہماری رہنمائی کر سکتی ہو تو اصول میں کوئی اصل ہے جس سے اس مسئلہ میں ایک جدید فرع نکالی جا سکتی ہو۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ برسوں کی کوششوں اور کاوشوں کے بعد بھی نہ ہماری آنکھوں میں آنی قوت بنیائی پیدا ہوتی ہے کہ خود رات کے نشانات دیکھ سکیں نہ ہمارے پاؤں میں آنی طاقت آتی ہے کہ اپنے بل بوتے پر آپ کھڑے ہوں اور استقلال کے ساتھ چل سکیں۔ اس لئے اس پر ہمیشہ مجبور ہوتے ہیں کہ کوئی طاقت ور بندہ خدائے جلّٰیٰ تو ہمیں گود میں اٹھا کر لے چلے۔

اس سے میرا مقصد یہ نہیں ہے کہ پچھلے مجتہدین یا ان میں سے کسی ایک کی تقلید کرنے کو ناجائز ٹھہراؤں یا انھوں سے اپنے علم اور اپنی ذہنی قابلیتوں سے اسلام کی جو خدمات کی ہیں ان کو بے کار قرار دوں۔ حاشا کہ میرے دل میں اس کا خیال بھی آیا ہو۔ میرا اعتراض دراصل اس ترتیب پر ہے جو تقدم اور تاخر کے معاملہ میں اختیار کرنی گئی ہے۔ میرے نزدیک دینی تعلیم میں سب سے مقدم قرآن ہونا چاہئے اور کوشش کرنی چاہئے کہ جہاں تک ممکن ہو سکے معانی اور اس کی تعلیمات کو زیادہ سے زیادہ سمجھا یا جائے اس کے بعد مت رسول و صحابہؓ کا مطالعہ ہونا چاہئے اور اس مطالعہ میں پڑھنے والے کی کوشش ہونی چاہئے کہ وہ اپنے آپ ذہنی طور پر قرن اول کے مکہ اور مدینہ کی ٹھیلوں میں نہچاڑے اور قریب قریب تمام پر پہنچ کر رسول اللہ اور آپ کے صحابہ کے آثار ملاحظہ کرے، اور اس بصیرت کے ساتھ ملاحظہ کرے کہ ان آثار میں جو اصول ہیں وہ الگ الگ ذہن نشین ہوتے جائیں، جو فروع ہیں وہ اپنی اپنی اصل کے ماتحت اس مقام پر درج ہوں جو مقام خود رسول اکرم اور صحابہ نے ان کو دیا تھا اور ان سب کے ساتھ تعلیم اسلام کا رابطہ جس نوعیت کا تھا وہ مجموعی طور پر سامنے آجائے۔ اس گہرائی کے ساتھ قرآن اور اس کی حقیقی تفسیر کا مطالعہ کرنے کے بعد ایک طالب علم کو دیکھنا چاہئے کہ

اُس خاص فقہی و کلامی مذہب کی تائید حاصل کی جائے جس کے پیروں نے وہ نصاب بنایا،
 رہا احادیث و آثار پر مشورہ اور اس سے اجتہاد کی قابلیت پیدا ہونا، تو یہ تو کسی کا مقصود ہے
 اور نہ کسی نصاب سے یہ فائدہ حاصل ہو سکتا ہے۔ آخر میں قرآن کا نمبر آگیا اور یہاں آپ نے
 کہ خود قرآن تو کسی نصاب میں داخل ہی نہیں ہے البتہ اس کی بعض تفسیریں داخل ہیں مگر
 وہ ایسی تفسیریں ہیں جن سے قرآن کی روح اور اس کے مغز ناپ بچھا کر لیا ہے اور اس پر
 یہ کہ اکثر نصابوں میں یہ تفسیریں بھی پوری شریک نہیں ہیں۔

اس غلط تعلیم کا نتیجہ تقلید جاد اور گمراہ بندوں کی شکل میں نمودار ہوا ہے ہمارے جہالت
 درکنار ہمارے علماء کا بھی بیشتر حصہ اسلام کی اصلی روح اور اکی صحیح تعلیم سے بے بہرہ ہو گیا ہے۔
 وہ براہ راست خدائی سچی ہدیٰ شمع ہدایت سے روشنی حاصل نہیں کرتے، بلکہ اس شمع سے جو مختلف
 چراغ روشن ہوئے ہیں ان کے گرد پروانہ وار جمع ہو گئے ہیں۔ اور ہر گمراہ اپنے منظور نظر چراغ
 کو اصلی شمع ہدایت سمجھنے لگا ہے۔ کُل جذبِ بمانند تیسرے فرعون لوگوں نے فروغ کو
 اصول کی جگہ دیدی ہے اور اصول کو فروغ کا درجہ دینے لگے ہیں۔ ایک صراطِ مستقیم سے ہر گمراہ
 مختلف گمراہیوں پر چلے گئے ہیں۔ اور ہر گمراہ صرف اپنی گمراہی کو اصلی صراطِ مستقیم
 سمجھنے لگا ہے براہ راست کتابِ اللہ اور سنتِ رسول سے استفادہ نہ کرنے اور سراسر فقہاء
 و مجتہدین کی رہنمائی پر اعتماد کرنے کا قدرتی نتیجہ یہ ہے کہ صدیوں سے ہم میں مجتہدین
 ہونے بند ہو گئے ہیں۔ ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو طلبِ علم میں عمریں بسر کر دیتے ہیں مگر نہ تو
 لاکھوں میں ایک صاحبِ علم بھی ایسا نہیں نکلتا جو اصولِ اسلام کو ٹھیک ٹھیک سمجھنے والا
 اور جو ضروریات پر ان کو منطبق کر سکے، اور جدید پیدا شدہ جزئی مسائل میں نئے قوانین کا
 انطباق کر سکے۔ ہر مسئلہ سب سامنے آتا ہے تو نظر بن چھپے علماء کی طرف اٹھتی ہیں اور کوئی

لہ میں نے یہاں عمومیت کے ساتھ تمام نصابوں پر حکم لگایا ہے۔ اگرچہ میں اس سے بے خبر نہیں ہوں
 اس جہت میں کچھ مستثنیات بھی ہیں لیکن سوادِ اعظم پر ان مستثنیات کا کوئی اثر نہیں ہے۔

تمدن و تہذیب کی ترقی کے ساتھ ساتھ جب معاملات نے وسعت اختیار کی انہی ہی ضروریات
 پیش آئیں۔ اور عقلی علوم کی اشاعت کے دین کے متعلق نئے نئے مسائل پیدا ہونے لگے، تو
 گذشتہ زمانے کے علماء نے کس طرح اصول سے فروع کا استنباط کیا، کلیات سے جزئیات
 نکلنے، معاملات کے لئے فقہی قوانین مرتب کئے اور عقاید کی تشریح و توضیح کی۔ اس ترتیب کے
 جب علم کا اکتساب کیا جائیگا تو اندہی تقلید اپنی مضر اثرات سمیت ختم ہو جائیگی جس حد تک
 مجتہدین کے اجتہادات تکے لئے کافی ہیں اس حد تک ہم ان کا اتباع کریں گے۔ اور جن
 معاملات میں وہ کافی نہیں ہیں انہیں ہم خود اجتہاد کر کے کتاب اللہ اور سنت رسول کے
 کا استنباط کریں گے۔ نیز اس کے گروہ بندیاں بھی اپنی اس شدت کیساتھ باقی نہ رہیں گی
 جو انہوں نے بعد کے زمانے میں اختیار کر لی ہیں۔ کیونکہ جو لوگ اس طریقہ سے علم دین کا مستفاد
 کریں گے ان کو اچھی طرح معلوم ہو جائیگا کہ دین کے اصول کیا ہیں۔ اور فروع کیا ہیں؟ اصول
 میں اختلاف کیا معنی رکھتا ہے اور فروع میں اختلاف کی کیا حیثیت ہے؟ کفر کیا ہے اور
 اسلام کی حدود کہاں تک وسیع ہیں؟ کفر و اسلام کا امتیاز کن اصول پر مبنی ہے؟ ایک شخص
 مرکز اسلام سے دور مٹ جانے کے باوجود کس حد تک دائرہ اسلام میں رہتا ہے اور
 کہاں پہنچ کر اس دائرہ سے باہر ہو جاتا ہے؟ اور جو شخص دائرہ اسلام کے اندر ہو مگر باہر
 رائے میں مرکز سے دور مٹ گیا ہو اس کے ساتھ ہمارا کیا برتاؤ ہونا چاہئے؟

مگر خرابی تو یہ ہے کہ تعلیم میں قرآن پر حدیث اور حدیث پر فقہ، عقائد اور کلام
 کو جو ترجیح دیجاتی ہے، وہ محض بھول چوک کا نتیجہ نہیں ہے، بلکہ ایک بڑی سوچی سمجھی ہوئی
 غلط فہمی کا نتیجہ ہے۔ لوگوں نے دیکھا کہ اسلام میں جتنے فرقے پیدا ہوئے ہیں وہ سب
 قرآن سے اور ثانیاً حدیث و آثار سے استدلال کرتے ہیں، اور قرآن مجید کی آیات
 اور احادیث و آثار کو اپنے مطالب کے معنی پہنکا کر ان پر اپنے مذہب کو بنیاد رکھتے
 ہیں۔ اس بنا پر گو علی الاعلان یہ نہیں کہا جاتا مگر عملاً یہ سمجھ لیا گیا ہے اور وہی زبان

بھی دیا جاتا ہے کہ اختلاف کا سب سے بڑا سرچشمہ قرآن ہے، اور اس کے بعد احادیث و آثار میں۔ یہ خیال کر کے علماء کے ایک بڑے گروہ نے اپنے نزدیک عافیت اس میں دیکھی کہ دینی تعلیم کو صرف ان کتابوں تک محدود رکھا جائے جو خاص اپنے مذہب کے مطابق فقہ عقاید اور کلام کے مباحث پر لکھی گئی ہوں۔ احادیث و آثار کو اس حد تک پڑھا یا جائے جس حد تک وہ اپنے مذہب کے لئے سند کا کام دے سکیں۔ اور قرآن مجید کو صرف تبرک کے طور پر پڑھ لیا جائے۔

یہاں اس تفصیل کا موقع نہیں کہ یہ غلط فہمی کن اسباب سے پیدا ہوئی اور کس طرح اس نے زور پکڑا۔ اس کی تفصیل ایک مستقل کتاب کی وسعت چاہتی ہے۔ کیونکہ گویا اسلام میں فرقوں کی پیدائش کی تاریخ ہے جس میں صرف واقعہ کی حد تک اس کو تسلیم کروں گا بلاشبہ تفرقہ کی بنیاد قرآن اور سنت رسول پر رکھی گئی ہے لیکن مجھے اس کے ماننے سے انکار ہے کہ اس کی ذمہ داری قرآن یا سنت رسول پر ہے۔ قرآن اور اس کے لئے والے نے تو ایک ہی دین اور ایک ہی سیدھا اور صاف راستہ پیش کیا ہے اور اس کی تو اصل دعوت یہ ہے کہ اس راہ راست میں تفریق نہ کرو۔ وہ تو کہتا ہے کہ **وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا** (۱۱: ۳) اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑ لو اور گروہ گروہ نہ بن جاؤ۔ اور **أَقِمُوا الدِّينَ وَلَا تَتَفَرَّقُوا فِيهِ** (۲: ۴۲) دین کو قائم کرو اور اس میں پراگندہ نہ ہو جاؤ۔ **وَأَنَّ هَذَا صِرَاطٌ مُسْتَقِيمٌ أَفَاتَّبِعُوهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيلِهِ** (۱۹: ۶) یہ میری سیدھی راہ ہے اس پر چلو اور الگ الگ راستوں پر نہ چلو کہ وہ تمہیں پراگندہ کر کے اللہ کی سیدھی راہ سے ہٹا دیں گے **وَاطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَلَا تَنَازَعُوا فَتَفْشَلُوا وَتَذْهَبَ رِيحُكُمْ** (۶: ۸) اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور آپس میں جھگڑے نہ برپا کرو کہ اس طرح تمہاری ہمتیں ٹوٹ جائیں گی اور تمہاری ہمتیں

اگر ہاے گی۔ وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ
 الْبَيِّنَاتُ وَأُولَئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ (۳: ۲) اور ان کو گون کی طرح
 نہ بن جاؤ جنہوں نے کھلی آیتوں کے آنے کے بعد تفرقے اور اختلاف برپا کئے کہ ایسے
 لوگوں کے لئے بڑا عذاب ہے إِنَّ الَّذِينَ تَفَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا لَسْتَ
 مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ (۲۰: ۶) جن لوگوں نے اپنے دین میں تفرقہ برپا کر دیا اور گروہ
 گروہ بن گئے۔ ان سے اے محمد تمہارا کوئی واسطہ نہیں ہے۔ پھر وہ احسان جاتا
 ہے کہ اللہ نے تم کو یہی راہ دکھا کر آپس کے تفرقوں اور باہمی عداوتوں سے
 بچالیا۔ اور تم سب کو بھائی بھائی بنا دیا۔ اذْكُرُوا نِعْمَةَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ اِذْ
 كُنْتُمْ اَعْدَاءً فَآتَفَّ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَاصْبَعْتُمْ يَنْعَمْتُمْ بِرَحْمَتِهِ اَخْوَانًا وَ
 كُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِنْهَا (۳: ۱۱)۔

لوگو! اپنے اوپر اللہ کی اس نعمت کو یاد کرو کہ تم آپس میں ایک دوسرے کے دشمن تھے
 اس نے تمہارے دلوں میں الفت ڈالی اور اس کی نعمت سے تم بھائی بھائی بن
 گئے۔ تم آگ سے بھرے ہوئے گڑھے کے کنارے پر تھے اس نے تم کو اس سے بچالیا۔
 اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تفرق فی الدین کی ذمہ داری قرآن اور رسول پر نہیں
 ہے، اور ہر وہ شخص جو قرآن اور اس کے لانے والے کو سچا مانتا ہے۔ اسے تسلیم کرنا چاہئے
 کہ یہ دونوں (جو حقیقت میں ایک ہی ہیں) اس ذمہ داری سے بری ہیں۔ مگر جب یہ
 واقعہ ہے کہ اختلاف کی نہریں کتاب و سنت ہی کے سرچشے سے پھوٹی ہیں تو غور
 کرنا چاہئے کہ آیا یہ واقعہ قرآن کے دعوے کی تکذیب کرتا ہے یا درحقیقت اس واقعہ
 سے قرآن کے دعوے پر کوئی اثر نہیں پڑتا؟ اور قرآن و سنت سے پیدا ہونے والا
 اختلاف باعتبار حقیقت اس اختلاف سے بالکل جداگانہ ہے جس کی بدولت دین
 میں تفریق واقع ہوتی ہے۔

اختلاف کی جتنی شکلیں دنیا میں نظر آتی ہیں ان سب پر نگاہ ڈالنے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ان کو دو بڑی قسموں پر تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ایک قسم کا اختلاف تو یہ ہے کہ دو یا بہت سی چیزیں اصل اور بنیاد میں متحد ہوں مگر چند ظاہری امور میں ان کے درمیان اختلاف ہو۔ اور دوسری قسم کا اختلاف یہ ہے کہ ان کے درمیان اصلی اور بنیاد اختلاف ہو۔ مثلاً ایک اختلاف پانی اور برت کا اختلاف ہے اور دوسرا اختلاف پتھر اور پانی کا ہے۔ ایک اختلاف یہ ہے کہ ایک ہی جسم کا ایک سر مشرق کی طرف ہے دوسرا مغرب کی طرف۔ اور ایک اختلاف یہ ہے کہ دو الگ الگ جسم میں جن میں سے ایک کا رخ مشرق کی طرف ہے اور دوسرے کا رخ مغرب کی طرف۔ ایک اختلاف یہ ہے کہ دو آدمی ایک ہی سڑک پر ایک ہی سمت میں چل رہے ہوں مگر ایک دائیں کنارے پر ہے دوسرا بائیں کنارے پر، ایک سوار ہے دوسرا پیدا، ایک تیز چل رہا ہے دوسرا سست۔ اور ایک اختلاف یہ ہے کہ دو آدمی دو الگ راستوں پر چل رہے ہیں۔ اور ایک مشرق سے مغرب کو جا رہا ہے دوسرا مغرب سے مشرق کو۔ ایک اختلاف یہ ہے کہ ایک ہی قوم کے مختلف گروہ رسم و رواج معاشرت کے طریقوں اور معاشی حالات کے اختلاف کی وجہ سے مختلف طبقات پر منقسم ہوں مگر من حیث القوم ایک ہوں۔ اور ایک اختلاف یہ ہے کہ دو مختلف قومیں اپنے ملکی حدود و تہذیب، تمدن، سیاست اور حکومت کے اعتبار سے مختلف ہوں اور ان کے درمیان کوئی ایسا رشتہ اور تعلق نہ ہو جو انہیں ایک دوسرے سے ملنے رہنے پر مجبور کرے۔

اختلاف کی یہی دو توں قسمیں مذہبی معاملات میں بھی پائی جاتی ہیں۔ ایک قسم کا اختلاف تو یہ ہے کہ دو آدمی یا دو گروہ ایک ہی دین کے پیرو ہیں اس کے اصلی اور بنیادی امور میں متفق ہیں۔ مگر عقاید اور عبادات و معاملات کے جزئیات میں ان کے درمیان اختلاف ہے اور یہاں اختلاف ان کو دین کے مشترک امور میں متفق ہونے سے باز نہیں رکھتا۔

دونوں میں سے ہر ایک نیک نیتی کے ساتھ سمجھتا ہے کہ دین کے فلاں حکم کی جو تعبیر کی گئی ہے وہی صحیح ہے، مگر اس کے ساتھ وہ یہ بھی سمجھتا ہے کہ مخالفت گروہ نے جو تعبیر کی ہے۔ وہ اس دین کے دائرے سے خارج کر دیتی ہے اور ہمارا آپس کا اختلاف صرف اس مسئلہ کی حد تک ہے۔ دوسری قسم کا اختلاف یہ ہے کہ دو گروہوں کے درمیان جس مذہبی مسئلہ میں اختلاف ہو اس کو وہ دین کا بنیادی سوال بنا لیں، دونوں ایک دوسرے گمراہ اور بے دین سمجھیں، اور ان کے درمیان کوئی ایسا امر مشترک باقی ہی نہ رہے۔ جس میں وہ باہم مجتمع ہو سکتے ہوں۔

پہلی قسم کا اختلاف رائے ایک فطری اختلاف ہے دنیا کے تمام نظری اور عملی مسائل میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہیں بتایا جاسکتا جس میں انسانی فطرت نے اس طرح کے اختلاف رائے اور اختلاف عمل کی شکل میں ظہور نہ کیا ہو۔ یہ معاملہ میں ہم یہ دیکھتے ہیں کہ لوگوں کے عقائد مختلف ہیں، خیالات مختلف ہیں، طریقے مختلف ہیں اور ان سب کی وجہ یہ ہے کہ ان کے لمبائے مختلف ہیں، نہ سب لوگ ایک طرح سے سوچتے ہیں۔ نہ ایک طرح سے سمجھتے ہیں۔ نہ ایک ہی زاویہ نگاہ سے دیکھتے ہیں نہ ایک طرح سے اثر اور فعل کرتے ہیں۔ اور نہ ایک ہی طرح متاثر اور منفعل ہوتے ہیں۔ ایک ہی واقعہ کا ایک شخص پر کچھ اثر پڑتا ہے۔ اور دوسرے پر کچھ ایک ہی شے کو ایک شخص کسی نظر سے دیکھتا ہے اور دوسرا کسی اور نظر سے ایک ہی بات کے معنی ایک شخص کچھ سمجھتا ہے اور دوسرا کچھ اور۔ ایک ہی مقصد کے لئے ایک شخص ایک طریقہ اختیار کرتا ہے اور دوسرا کسی اور طریقہ سے کام لیتا ہے۔ ایک ہی فعل سے ایک شخص کا کچھ مقصد ہوتا ہے اور دوسرے کا کچھ اور غرض بنی آدم میں عقل فہم اور افتاد طبع و انداز فکر کے لحاظ سے جتنا تفاوت ہے اتنا ہی ان کے خیالات اور ان کے طریقوں میں بھی فرق ہے۔

اس فطری اختلاف اور تفاوت کی وجہ سے قرآن اور سنت کے سمجھنے اور اس کے

مطابق عمل کرنے میں بھی اختلاف ہو سکتا ہے اور ہوا ہے۔ گو قرآن کی آیات متصل اور متین ہیں، اور رسول اکرم نے ان کے اقوال سے ان کے معانی کی اور زیادہ تشریح کر دی ہے اور اپنے اعمال سے ان کا ایک واضح نمونہ پیش کر دیا ہے۔ مگر اس کے باوجود انسانی طبیعت کا تقاضا یہی ہے کہ ہر آیت اور حدیث کے معنی سب لوگ ایک ہی سمجھیں اور ہر عمل اور نمونے کو سب لوگ ایک ہی طرح نہ دیکھیں۔ اس فہم و نظر کے اختلاف کا اگر تجزیہ کیا جائے تو اس کا بھی مختلف صورتیں پائی جائیں گی مثلاً۔

کچھ لوگ پہلے سے کوئی خاص رائے قائم رکھے بغیر آیات اور احادیث کے معنی و مفہوم اور مقصد و مدعا کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کے ذہن میں پہلے سے کچھ خیالات جیسے ہوئے ہیں۔ پھر وہ انہی خیالات کے مطابق آیات و احادیث کی تاویل کر لیتے ہیں۔

کچھ لوگ سادہ الفاظ اور صحیح الفکر ہوتے ہیں۔ وہ ہر چیز کا سیدھا اور صاف مفہوم لیتے ہیں۔ صرف کامل کی بات لے لیتے ہیں۔ ان باتوں سے تعرض نہیں کرتے جن میں کچھ سے کوئی فائدہ نہ ہو۔ غلات اس کے کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں۔ جن کے دماغ میں لہجہ ہوتا ہے، کسی چیز کو سادہ اور صاف طریقے سے پہنچا کر سمجھ ہی نہیں سکتے ہر چیز کو زنجیری اور ڈیڑھی شاہ سے دیکھتے ہیں۔ اور کام کی باتوں کو چھوڑ کر بے کار باتوں میں الجھ جاتے ہیں۔

کچھ لوگوں کی نظر گہری سمجھ تیز عقل رسا، فکر بالغ ہوتی ہے۔ وہ بات کی تہ کو پہنچ جاتے ہیں۔ کچھ لوگوں کی نظریں سطحی ہوتی ہیں۔ عقل میں رسائی اور سمجھ میں تیزی نہیں ہوتی۔ اس لئے وہ صرف ظاہر کو دیکھ سکتے ہیں۔ اور باطن تک نہیں پہنچ سکتے۔ اسی طرح لوگوں کے مبلغ و معنی میں اختلاف ہوتا ہے بعض لوگوں کے پاس ذرائع معلومات وسیع ہوتے ہیں۔ اور بعض لوگوں کا علم محدود ہوتا ہے۔

کچھ لوگوں کے مزاج میں اعتدال ہوتا ہے، وہ شدت اور افراط و تفریط سے بچے رہتے ہیں بخلاف اس کے کچھ لوگ فطرۃً انتہا پسند ہوتے ہیں۔ اس لئے وہ مرکز سے بہت دور کسی ایک جانب جھک پڑتے ہیں۔ اور انتہا کو پہنچ جاتے ہیں۔ ان مختلف صورتوں میں سے کوئی بھی ایسی نہیں ہے جو دین میں رخنہ ڈالنے والی ہو اگر بدینتی شامل نہ ہو تو خواہ کتنے ہی مختلف وجوہ سے قرآن اور سنت کی تاویل کی جائے اس پر غلطی کا حکم لگایا جاسکتا ہے۔ مگر بے دینی کا حکم نہیں لگایا جاسکتا ہے اور بدینتی کا معنی ایسا ہے کہ اس میں قطعیت کے ساتھ حکم لگانا آدمی کے لئے مشکل ہے کیونکہ نیتوں کا حال خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا ہم صرف ظاہری علامات کو دیکھ کر کسی کے متعلق یہ رائے قائم کر سکتے ہیں کہ اس نے بدینتی کے ساتھ ایسا کیا ہے لیکن اس میں کسی نہ کسی حد تک یا امکان ضرور باقی رہتا ہے کہ شاید اس نے کج فہمی، باغیانہ و ت ذہن یا انتہا پسندی کی بنا پر ایسا کیا ہو۔ علاوہ بریں یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ ایک واقعی بدینت شخص نے کتاب و سنت کی غلط تاویل کر کے جو مذہب نکال لیا ہو اس کے پیرو بھی واقعی بدینت ہوں ہوتے ہیں کہ انہوں نے نادانی، لڑائی، بدینتی کے ساتھ اس کی پیروی اختیار کی ہو لہذا اعتقاد اور عملی طریقوں کے اختلاف میں نیت کے سوال سے قطع نظر کر کے صرف یہ دیکھنا چاہئے کہ اختلاف اصل اور بنیاد میں ہے یا فروع اور جزئیات میں اس نقطہ نظر سے اگر دیکھا جائے گا تو معلوم ہوگا کہ قرآن اور سنت نے اصل اور بنیاد یعنی الدین اور ضابطہ مستقیم میں کسی اختلاف کی گنجائش باقی نہیں رکھی ہے، البتہ فروع اور جزئیات یعنی مسائل اور مناجح میں اختلاف کی گنجائش چھوڑ دی ہے تاکہ ہر شخص دین کے دائرے میں رہتے ہوئے اپنی قابلیت اور استعداد اور رجحان طبع کے لحاظ سے جس معنی و مفہوم کو سمجھ سکتا ہو سمجھے اور جس طریق پر مطمئن ہو سکتا ہو، اپنا اطمینان کرے اگرچہ اس میں بھی جو فروع اور جزئیات اہمیت رکھتے تھے ان میں زیادہ سے زیادہ ممکن تو منہج و تشریح کے کام لیا،

مثال کے طور پر توحید ایک بنیادی عقیدہ ہے اس میں یہ گنجائش مہرگز نہیں چھوڑ
 گئی ہے کہ کوئی شخص خدا کو ایک سمجھے، کوئی دو، کوئی تین اور پھر بھی رب سب ان
 رہیں خدا کے ایک ہونے پر سب کو ایمان لانا پڑے گا۔ البتہ اس وحدت
 کا جو مفہوم ایک پڑھا مسلمان سمجھتا ہے وہ ظاہر ہے کہ ایک دیہاتی نہیں سمجھ سکتا ہے۔
 ایک فلسفی کے ذہن میں وحدت کے جو معنی ہوں گے وہ ایک عامی کے ذہن میں نہیں آسکتے
 مگر اس کے مختلف معانی سمجھنے کے باوجود وہ جب تک خدا کو ایک سمجھتے ہیں۔
 اس وقت ایک ہی اصل توحید پر متفق رہیں گے۔ اسی طرح ملائکہ کتب آسمانی
 یوم الدین، انبیاء و رسل کے معاملے میں جو اصل اور بنیادی اعتقاد قرآن و
 سنت نے پیش کیا ہے۔ اس میں اختلاف کی گنجائش نہیں ہے۔ یہ ممکن نہیں ہے
 کہ کوئی شخص ملائکہ کے وجود سے انکار کر دے، یا کتب آسمانی کے کلام الہی کے
 منکر ہو یا یوم الدین کے آنے کو نہ مانے، یا رسالت کا اقرار نہ کرے، یا قرآن میں جن
 رسولوں کا نام بصرحت لیا گیا ہے ان میں سے کسی کی رسالت سے انکار کرے اور پھر
 مسلمان بھی رہے۔ لیکن ملائکہ و وحی رسالت اور قیامت وغیرہ کی حقیقت اور ان
 معانی سمجھنے میں اختلاف ہونا ممکن ہے۔ اور جب تک کوئی شخص اصل عقیدہ سے
 انکار نہ کرے اس وقت وہ کسی تاویل کی بنا پر دین سے خارج نہیں ہو سکتا یہی
 حال اعمال کا ہے۔ خدا اور رسول نے جن اعمال کو فرض قرار دیا ہے یا جن کی
 ناکید فرمائی ہے یا جن کو حرام قرار دیا ہے، یا جن سے تبصریح منع فرمایا ہے انکے
 نفس فرض، یا نفس حرام، یا نفس ہو کد، یا نفس ممنوع ہونے میں اختلاف کی
 گنجائش نہیں ہے کوئی شخص فرض کو یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ حرام نہیں ہے البتہ
 اعمال کے طریقوں اور ان کی صورتوں میں اختلاف ہو سکتا ہے اور اس اختلاف
 سے اصل دین میں کوئی رخنہ نہیں پڑتا۔

پس قرآن اور سنت رسول اللہ سے جو اختلاف پیدا ہو وہ اصل دین کا اختلاف نہیں ہے جس سے تفرق فی الدین پیدا ہوتا ہو، بلکہ وہ منابج اور مسالک میں رائے اور طریقوں کا قطری اختلاف ہے جس کے رونما ہونے سے جل اللہ کے ٹکڑے ٹکڑے نہیں ہوتے، اعراض مستقیم مختلف رنگ و نڈیوں میں تقسیم نہیں ہو جاتی، ہدایت گراہی میں نہیں بدلا جاتی، ایک ملک کی کوئی امتیں نہیں بن جاتیں۔ جماعت کا شیرازہ درحکم برہم نہیں ہوتا اور وہ تنازع برپا نہیں ہوتا جس سے ہمتیں ٹوٹ جائیں اور ہوا اکھڑ جائے۔ یہ قسم کا اختلاف اور تفرقہ قرآن اور سنت سے پیدا نہیں ہوا ہے بلکہ خود ہمارے اپنے نفس کی شرارتوں سے پیدا ہوا ہے اس کی ذمہ داری قرآن و سنت پر نہیں بلکہ قرآن و سنت سے غافل ہونے اور جاہل رہنے پر ہے اور یہ وہ تفرقہ و اختلاف ہے جسے بیدار کرنے کے لئے نہیں بلکہ مٹانے کے لئے قرآن اتارا گیا ہے۔ اور رسول کو مبعوث کیا گیا ہے۔

میرے کہنے کی غرض یہ ہے کہ دین میں اصل فتنہ، اختلاف کا فتنہ نہیں بلکہ تشیع اور تخریب اور تعصب کا فتنہ ہے۔ ہر گروہ کا صرف اپنے مذہب یا اپنے مذہب اپنے منہاج، اور اپنی شرکت کو اصل دین اور ایک ہی صراط مستقیم قرار دینا۔ دوسرے کو خارج از دین اور گم کردہ راہ سمجھنا اسلامی عصبیت کو چھوڑ کر فریاد عصبیت اختیار کرنا، آپس میں عداوت اور ایک دوسرے سے نزاع رکھنا، یہی اصلی فتنہ ہے، اس کو قرآن نے تفرق فی الدین سے تعبیر کیا ہے یہی وہ خبر ہے جس سے بچنے کی قرآن میں بار بار تاکید کی گئی ہے اور اسی کے متعلق فرمایا ہے
 اِنَّ الَّذِیْنَ خَرَقُوْا دِیْنَہُمْ وَاٰمَنُوْا شِدًّا کُنْتُمْ فِیْ شَیْءٍ
 جو لوگ اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیتے ہیں اور گروہ بن جاتے ہیں ان سے تم نہیں ان سے کوئی واسطہ نہیں ہے اس دین کی وسعت ظاہر کرنے کے لئے اللہ نے آ

یہی سے تعبیر کیا ہے اور حکم دیا ہے کہ تم اس رسی کو تھامے رہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خواہ تم نے اس رسی کو کسی کنارے پر بٹے پکڑا ہو یا بیچ میں سے مشرق کی طرف سے یا مغرب کی طرف سے، یا لٹے ہاتھ سے یا الٹے ہاتھ سے بیٹھے بیٹھے یا کھڑے کھڑے، بہر حال جب تک اس رسی کو تم تھامے رہو گے تفرق اور پراگندگی سے محفوظ رہو گے اور جب تم اس پر گروہ اپنی گرفت کی اختتام ہوتے ہی اس کو کاٹ ڈالے گا۔ اور اس رسی کے مختلف ٹکڑے مختلف گروہوں میں بٹ جائیں گے تو پھر تم ہی نہیں بلکہ تمہارا دین بھی بٹ جائے گا۔ دنیا میں تمہاری ہوا اٹھ جائے گی اور آخرت میں تمہارا یہ حال ہو گا کہ خود ہر گروہ کا سردار محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تم سے کوئی واسطہ نہ ہو گا۔

پس مذاہب اور مذاہب کے اختلاف کو دین کا اختلاف سمجھنا بنیادی غلطی ہے۔ دین تو ایک ہی ہے جس کو قرآن اور صاحب قرآن نے پیش کیا ہے۔ البتہ اس دین کو سمجھنے اور برتنے کے طریقے مختلف ہو سکتے ہیں اور ان طریقوں کا اختلاف فطری ہے۔ جس سے گھبرانے کی کوئی وجہ نہیں ہے قرآن خود کہتا ہے کہ لِكُلِّ جَعَلْنَا مَذَهَبًا لَّهُمْ فَاسِيكُوهُ (۲۲: ۱۹) ہم نے ہر گروہ کے لئے ایک طریقہ مقرر کر دیا ہے اور ہر گروہ اس سے چلتا ہے۔ اور لِكُلِّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَمِنْهَا حَا (۵: ۷) ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لئے ایک طریقہ اور ایک راستہ مقرر کر دیا ہے۔ ان طریقوں کے اختلافات سے ڈر کر نفس قرآن کو جو اصل دین ہے، چھوڑ بیٹھنا اور اس کے اختلافات برتنا کوئی عقلمندی نہیں ہے قرآن کے مطالعہ سے جزئیات و فروع میں تاویل و تعبیر کے اختلافات ضرور پیدا ہوں گے۔ مگر کلیات اور اصول جن پر دین کا مدار ہے لوگوں کے دلوں میں جاگزیں ہو جائیں گے۔ اور وہ جس قدر زیادہ جاگزیں ہوں گے اسی قدر تفرق فی الدین اور تخریب و تشیع کے فتنے کا قلع قمع ہو گا۔

سائنس کی ایک اہم تحقیق اور قرآن

(خان بہادر حاجی شیخ رحیم بخش ایم اے)

عام طور پر یہی سمجھا جاتا رہا ہے کہ آسمانوں میں روحانی ہی روحانی مخلوقات ہیں اور بعض نے تو آگے بڑھ کر کہہ دیا کہ ”آسمان فقط حد نظر ہیں اور کچھ نہیں قرآن کا دائرہ تخیل جو رب العالمین کا آخری پیغام ہے۔ ان ساری حدود سے بالاتر ہے۔ انسانی عقول و افہام مفروضات و عرف عام سب کے سب ناقص ہیں۔ قرآن کریم کی نظریات تعلیمات سے روشنی پاتے ہیں۔ قرآن کریم آفتاب کی طرح روشن ہے۔ عقول افہام عرف عام سب کو روشن کرتا ہے۔ پانی کی طرح پاک و صاف ہے۔ اور سب کو پاک و صاف کرتا ہے۔ فضائے بسط کی طرح بسط ہے اور سائے عالموں پر حاوی ہے۔ دنیا کی ساری تحقیقات، ساری ایجادات سارے انکشافات دوسری کتابوں کی تعلیمات پر تو انقلابی اثر ڈال سکتے ہیں۔ مگر قرآن کریم کی تعلیمات پر کوئی انقلابی اثر ڈالنے کے بجائے یہ سب خود بخود قرآنی تعلیمات کے مظاہر بن جاتے ہیں یہ قرآن کریم کی عالمگیر صداقت کا درخشاں معجزہ ہے۔ مریخ یا دوسرے اجرام سماوی میں حیات و نشوونما کے وجود کا امکان و ایقان آج سب کے ہنسیوں معلوم ہو رہا ہے۔ مگر یہ کوئی نئی بات نہیں۔ آج سے تقریباً چودہ سو برس پیشتر ہی قرآن نے آسمانی مخلوقات کے متعلق یہ ارشاد فرمایا تھا۔

وَمِنَ آيَاتِهِ خَلْقُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا مِنْ كُلِّ ذَاتٍ وَهُوَ عَلَىٰ جَهَنَّمَ خَافٍ دَائِبٌ (شورے رکوع ۴)

ترجمہ۔ اور یہ بات بھی اس کی ایک نشانی ہے بنانا آسمانوں اور زمین کا اور پھیلا دینا آسمانوں اور زمین میں دایہ یعنی ذی حیات مخلوق کا اور وہ جب چاہتے ان سب کو کٹھا کر سکتا ہے۔